محمد حنیف ندوی

مسئلہ خلق قرآن کا تاریخی پس منظر

مسئلہ صفات کا ایک شاخسانہ خلق قرآن کا مسئلہ بھی ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس سے زیادہ شرمناک واقعہ کی مثال ملنا مشکل ہے۔ کہ محض ایک نظری مسئلہ میں حکومت ایسے ایسے ائمہ علم و عمل کو ہدف تظلم ٹھہرائے۔ کہ جن کی جلالت قدر پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسی کڑی سزائیں دے کہ خطرناک مجرم بھی جن کے تصور سے کانپ جائیں۔ زیادہ تعجب اس پر ہے، کہ یہ عہد عباسیوں کی علمی ترقی و دور کا ہے۔ اس میں یونانی دفینوں کو پہلی دفعہ زندگی بخشی گئی۔ مختلف فنون کی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ اور مسلمانوں میں علمی نقطۂ نگاہ سے، ایک نئے زمانہ کا آغاز ہوا۔ ان خلفاء کو اس لحاظ سے نظریات و افکار کے معاملہ میں جس درجہ رواداری، تحمل اور سمجھ دار ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ظاہر ہے مگر اس پر ماتم کیجئے، کہ اسی دور تدریں میں، اسی عہد حکمت میں اور عباسیوں کے اسی زمانۂ روشن ضمیری میں۔ امام اہل السنت، احمد بن حنبل کی پیٹھ پر کوڑے برسائے گئے۔ مسہر، حماد، اور ابو یعلی ایسے نادرۂ روزگار علماء کو قید و بند کی سختیاں جھیلنے پر مجبور کیا گیا۔ ایک پہلو سے اسلامی تاریخ کا یہی باب بہت تابناک اور روشن بھی ہے۔ کہ اس میں پہلی دفعہ ظالم بادشاہوں کے سامنے، ان کی مرضی اور منشا کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا گیا۔ اور استقامت عزیمت کا ایسا شاندار نمونہ پیش کیا گیا۔ کہ جس سے ملوکیت کا پندار اور رعب و داب خاک میں مل گیا۔ غور تو فرمائیے۔ کہ تین تین بادشاہوں نے حضرت امام کو اپنے جور و تعدی کا تختۂ مشق بنایا لیکن استقلال و ہمت کے اس پیکر اور ارادہ و رائے کے اس کوہ پر وقار کو ان میں سے کوئی بھی جھکا نہ سکا۔

یہ برابر عزم و دم کے ساتھ اپنے دعاوی پر قائم رہے۔ تاریخ کا طالب علم اس مرحلہ پر قدرتاً سوچے گا کہ محض ایک کلامی مسئلہ میں جس میں بحث و تمحیص کی گنجائش ہے۔ عباسیوں کو اس درجہ غلو کیوں ہوا۔ اور یہ غلو اس حد تک کیوں بڑھا کہ اس سلسلہ میں امام احمد ایسی جلیل القدر ہستی کی تذلیل روا رکھی گئی۔ اور اس مسئلہ نے آخر اتنی اہمیت کیوں اختیار کر لی کہ حکومت نے اس کی پشت پناہی کو ضروری سمجھا۔ اگر یہ ثابت ہو ہی جاتا۔ کہ قرآن مخلوق نہیں ہے۔ تو اس سے ایوان ملوکیت میں کیا قیامت آ جاتی۔ اور عباسیوں کے عرش اقتدار میں کہاں رخنہ پیدا ہو جاتا۔ اسی طرح یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ائمہ اہل السنت اور سلف نے اس مسئلہ کو اتنا اہم کیوں قرار دیا۔ اور اس کی خاطر کیوں اس درجہ محن برداشت کئے۔ زیادہ سے زیادہ یہ مسئلہ صفات کے دوسرے مسائل کی طرح اتنا ہی شائستہ اعتنا تھا کہ اس کو متعلقہ کتابوں میں واضح کیا جاتا۔ یا اپنے اپنے حلقہ ہائے درس میں کھول کر بیان کیا جاتا۔ اس سے زیادہ نہیں۔

بات یہ ہے کہ عباسی ایک کشمکش کے بعد برسر اقتدار آئے تھے۔ اور ان کے حق میں یہ کہنا بالکل بجا نہیں کہ ان کی
حکومت بنو امیہ کی عربیت کے خلاف عجمی عناصر کی فتح کے مترادف تھی۔ یہ عجمی عناصر کیا چاہتے تھے؟ اور ان کا عقلی مزاج
کس ڈھنگ کے مذاہب و افکار پر مطمئن ہو سکتا تھا۔ اس کو تاریخ کا ہر طالب علم اچھی طرح جانتا ہے۔ عباسی خلفاء اگر [illegible] کتاب
وسنت کے رجحانات کی تائید کرتے، اور خلق قرآن ایسے عقلی فتنوں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے، تو اس سے بالواسطہ اس
گروہ کی تائید ہوتی جس نے عربی ثقافت اور عربی عصبیت و تعصبات کے بل بوتے پر، اسّی برس تک داد حکومت دی
اور یہی تو وہ غلطی تھی، جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہماری رائے میں یہ بات ہرگز قرین قیاس نہیں۔ کہ محض
ایک عقیدہ و نظریہ کا اختلاف اس درجہ عتاب و برہمی کا موجب ہو سکتا ہے کہ اس کی خاطر اسلام کے موقر ترین نفوس
کو قید و بند کی مصیبتوں میں ڈالا جائے۔ عباسی دراصل یہ چاہتے تھے کہ عربی عصبیت کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے۔ جو کہ
پھر کبھی وقت بھی ان کے حق میں مضر ثابت ہو سکتی تھی۔ اور اس کے بجائے ایک رلی ملی تہذیب و تمدن کو رواج دیا جائے
جس کے آغوش میں الحاد و زندقہ کے تمام جراثیم آسانی سے پرورش پا سکیں۔ محدثین اور سلف چونکہ قرآن و حدیث کی
سادہ تعلیمات پر مٹے ہوئے تھے۔ اور ان کے نقطہ نظر سے قرآن و حدیث کی ترجمانی و اشاعت اس وقت تک مکمل نہیں ہو پاتی
تھی، جب تک کہ عربیت کی اس آب و ہوا اور تہذیب و ثقافت کو زندہ نہ رکھا جائے جس میں کہ اسلام آیا۔ اس لئے عباسی
خلفاء ان سے طبعاً خائف تھے۔ اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ رنگ لائے۔ معاملہ کی اس توجیہ سے
اس سیاسی پس منظر کی تشریح بھی ہوتی ہے کہ جس میں شعوبیت، ایسی ناہنجار تحریک نے جنم لیا۔

رہا یہ مسئلہ کہ سلف و محدثین کو اس مسئلہ سے غیر معمولی دلچسپی کیوں تھی؟ تو اس حقیقت کو جاننے کے لئے یہ ضروری ہے
کہ نفس مسئلہ اور اس کے متعلقات و نتائج پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔

آنحضرت ؐ نے فرمایا تھا کہ تم یہود کی پیروی کرو گے اور ان کی فکر و عمل کی گمراہیوں کا اس حد تک تتبع کرو گے، کہ اگر
ان میں کسی بدبخت نے اپنی ماں سے زنا کیا ہے، تو تمہیں بھی اس میں باک نہیں ہوگا، صادق و مصدوق کی یہ پیشین گوئی حرف
بحرف پوری ہوئی۔ لوگاس (Logos) یا کلمہ کا مسئلہ صدیوں عیسائیوں میں زیر بحث رہا ہے، اور بالکل اسی انداز
میں اور انہی موشگافیوں کے ساتھ کہ جن کے بارے میں مسلمان متکلمین و حکماء یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ خالص ان کے مخترعات
سے ہے۔ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پولس کے مخصوص تصورات کی وجہ سے اس مسئلہ نے اس درجہ اہمیت حاصل کر لی تھی
کہ مؤلفین اناجیل نے بھی اس پر اظہار رائے ضروری سمجھا تھا کہ ایک انجیل تو شروع ہی ان کلمات سے ہوتی ہے۔ کہ "ابتداء
میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا" اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے، کہ خدا اور
کلام کے جھگڑے نے عیسائیوں اور دوسری قوموں میں اس وقت کیا صورت اختیار کر لی تھی۔ مابعد کے عیسائی لٹریچر سے وہ
تمام بحثیں منظر عام پر آتی ہیں۔ جو بعینہ مسلمان متکلمین میں موضوع سخن رہیں۔ عباسی عہد میں چونکہ صابی اور نسطوری عیسائیوں

کے عقائد و افکار کو اچھا خاصا فروغ حاصل ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کے زاویے بھی بدلے اور جدلیات کا وہ ذخیرہ بھی منتقل ہوا۔ جو ان کے ہاں اب بالکل کہنہ اور از کار رفتہ ہو گیا تھا۔ لیکن مسلمان متکلمین و حکماء میں اس میں اب بھی تازگی اور اچھی خاصی جاذبیت تھی۔ یہی سبب ہے کہ عیسائی اور صابی جن افکار و تصورات کی عفونت سے بے زار ہو گئے تھے، ہمارے ہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

ہم اس سے بحث نہیں کرتے کہ مسئلہ خلق قرآن اول اول کیونکر فکر و نظر کے لئے فتنہ سامانیوں کا موجب ہوا اس میں کیا ارتقاء ہوا۔ اور باہمی بحث و مناظرہ نے کن کن پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ سردست ہم اس کے نتائج و عواقب کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اور ان کی خطرناکی واضح کرنا چاہتے ہیں، تا کہ معلوم ہو سکے، کہ محدثین نے جو موقف اختیار کیا۔ وہ کس درجہ ضروری تھا۔ اور اگر وہ اس شدت، اس عزیمت اور استقلال کے ساتھ، اس فتنہ کا مقابلہ نہ کرتے، تو مسلمانوں کے افکار و عقائد میں کیا افراتفری مچتی اور کس درجہ انتشار و فوضویت کے لئے راہیں ہموار ہوتیں، حکماء اسلام جیسے ابن سینا وغیرہ ہیں۔ انہوں نے تو قرآن کے مخلوق ہونے سے یہ سمجھا۔ کہ کلام اس ایک طرح کا افاضہ ہے اور نبوت صرف اس حقیقت سے تعبیر ہے۔ کہ پیغمبر کے دل میں مفاہیم و اعمال کا ایک نقشہ پیدا کر دیا جاتا ہے جس پر زبان اور پیرایۂ بیان کا گوشت پوست پیغمبر خود چڑھاتا ہے۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور اس کا انداز بیان الہامی نہیں صرف مفہوم و معنی الہامی ہے۔ یہی نہیں۔ الہام کا تصور ان حکماء کے ہاں ایسا ہے کہ جس سے متضمنات نبوت کی یکسر نفی ہوتی ہے۔ جبریل ملکات نبوت میں سے ایک ملکہ قرار پاتا ہے۔ اور وحی و القاء و تکلم ایسے الفاظ اپنا دینیاتی مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔

معتزلہ کے غالی گروہ نے قرآن کے مخلوق ہونے سے یہ رائے قائم کی۔ کہ اس کے معجزانہ الفاظ و حروف ہر طرح کے احترام سے محروم ہیں۔ چنانچہ قرآن کی جلد، اور اس کے مقدس اوراق، کا نفس قرآن سے اتنا بھی تعلق نہیں۔ جتنا لیلےٰ کا دیار لیلےٰ سے ہو سکتا ہے۔ اس گستاخانہ طرز عمل پر دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دیار لیلےٰ ہیں تو بہرحال لیلےٰ کا رہنا ثابت ہے مگر قرآن کے یہ الفاظ و حروف صرف سیاہی، اشکال و صور، اور ایسی عبارت پر مشتمل ہیں، جو اس قرآن کے معنی و مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو مخلوق ہے، اس بدتمیزی نے یہاں تک ترقی کی، کہ بعض بدبختوں نے قرآن کو پاؤں تلے روند ڈالنے میں بھی کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ ان گمراہیوں کی وجہ سے، قرآن و سنت کی دعوت کو کتنا گزند پہنچا، اس کی ایک جھلک ابو الوفاء ابن عقیل کے ان الفاظ میں دیکھئے۔

اما بعد فان سبیل الحق قد عفت آثارها، و قواعد الدین قد انحط شامخها و الید قد تخرمت نارها و ظهر فی الآفاق شرارها۔ و کتاب اللہ عز و جل۔ بین عرض ینتقل و علی السنة الطغام بعد الاحترام یتبذل و تقرب ایاته بایات جدالاً و خصاماً

وتنتهك حرمته، لغواً وآثاماً۔ قد هون في نفوس الجهال بانواع المحال حين قيل ليس في المصحف الا الورق والخط المستحدث المخلوق وان سلطت عليه النار احترق المخلوق و اشكال في قرطاس قد انفقت انهاء حرمته و امتهانه بقيمته و تلفيفاً في حقوقه بفجوراً بفضيلة حتى لو كان القرآن حياً ناطقاً لكان من ذالك متظلماً ومن هذه البدعة متالماً [1]

حق کو رہیں اور ان کے نشانات محو ہو چکے ہیں۔ دین کی بنیادیں بر سر انحطاط ہیں۔ بدعت کے شعلے اٹھ رہے ہیں اور ایک دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ اللہ عزوجل کی کتاب عوام میں ہدف اعتراض ہے۔ جس پر کہ چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ اور جاہل بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں۔ اور اس کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں، آیات و نصوص کو آیات ہی سے بھڑا دیا جاتا ہے اور عجیب عجیب تناقضات پیدا کئے جاتے ہیں۔ تاکہ جدل و خصومت کے تقاضوں کی تسکین ہو۔ اور قرآن کی عظمت و توقیر کو نقصان پہنچے۔ بہت سے دینی محالات کے ارتکاب کو جہاں کی نظروں میں آسان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً کھلے بندوں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ قرآن میں سوا کاغذ اور مخلوق و مستحدث رسم الخط کے اور کیا رکھا ہے۔ آگ اگر اس پر مسلط کر دی جائے، تو اس کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے، یہ تو اشکال و صور کی ایک گٹھڑی ہے۔ اور بس اس طرح کے الفاظ سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کی وقعت کم کی جائے۔ اس کی قدر و قیمت گھٹائی جائے، اور اس کے حقوق و تکریم و اعزاز کا انکار کیا جائے۔ قرآن اگر زندہ ہوتا۔ اور اس کو گویائی کی طاقت بخشی جاتی تو ان بدعات کے خلاف باقاعدہ احتجاج کرتا۔ اور اپنی مظلومیت و الم کا اظہار کرتا۔

واضح ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جس کے بارہ میں پروردگار عالم کا ارشاد ہے۔

بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ (بروج ٢٢)

انه القرآن كريم في كتاب مكنون لا يمسه الا المطهرون تنزيل من رب العلمين (الواقعہ ٨٠)

لو انزلنا لهذا القرآن على جبل لرايته خاشعاً متصدعاً من خشية الله (الحشر ٢١)

كلا انها تذكرة فمن شاء ذكره في صحف مكرمة مرفوعة مطهرة بايدي سفرة كرام بررة قتل الانسان ما اكفره (عبس ١٦)

یہ ہے وہ تاریخی پس منظر جس میں کہ اس مسئلہ کی ٹھیک ٹھیک اہمیت واضح ہوتی ہے یعنی ایک طرف تو عباسی حکمرانوں کو یہ منظور تھا کہ عجمیت و عربیت اور تعصبات کو قائم نہ رہنے دیا جائے اور ہر اس رجحان کی مخالفت کی جائے جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے۔ اور دوسری طرف اس عقلی مسئلہ نے ایسی بدتمیزی اور الحاد کی شکل اختیار کر لی تھی کہ اگر محدثین آڑے نہ آتے تو عوام کے دلوں میں قرآن کا احترام بالکل اٹھ جاتا۔

---

[1] الصواعق المرسلہ ابن قیم مطبوعہ مطبع سلفیہ ص ٣٢٢ تا ٣٢٦